

محرک

سندس جبیں

سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت لے آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں
گم بھی ہوسکتے ہیں تاریخ کے اوراق میں ہم
مل بھی سکتے ہیں مگر تازہ فسانوں میں کہیں

عمر کا رزلٹ کارڈ میرے سامنے تھا اور اس بار پھر لی گریڈ، میرا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ میں نے خود پہ قابو پانے کی قطعی کوشش نہ کی بلکہ اس پہ برس پڑا۔

''حد ہوگئی عمر! اتنا بُرا رزلٹ؟ میرے پورے خاندان میں بھی کسی کا نہیں آیا۔ ناک کٹوا کے رکھ دی میری۔ چاہتے کیا ہو آخر؟'' میں نے اسے اور بھی بہت کچھ کہا۔ جب خوب دل کی بھڑاس نکال چکا تو اس سے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''آپ کو صرف یہ ٹینشن ہے کہ اس بار بھی رزلٹ آپ کے معیار کے مطابق نہیں؟ صرف یہ ٹینشن ہے کہ لوگ کیا کہیں گے؟ آپ کی عزت پہ حرف آئے گا۔ آپ جیسے ہائی کوالیفائڈ شخص کا بیٹا بی گریڈ لیتا ہے۔ بہت انسلٹنگ ہے نا آپ کے لیے؟ آپ مجھے اپنے لیے پڑھا رہے ہیں نا؟ تو سن لیں مجھے پڑھنا ہی نہیں......'' وہ روہانسا سا ہو کر کہتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں ساکت سا کھڑا اس کے الفاظ پر غور کرتا رہ گیا۔ کیا کہہ گیا تھا وہ۔ کیا والدین بچوں کو اپنے لیے پڑھاتے ہیں؟ میں نے ایسا کیا کہا تھا؟ کب چاہا تھا؟ وہ بے وقوف جانتا ہی نہیں کہ میں تو خود ان کے لیے...... میرا دل دُکھ سے بھر گیا تھا۔

مجھے اسے بتانا چاہیے آخر جب تک میں اسے بتاؤں گا نہیں وہ کیسے جان پائے گا۔ ایک فیصلہ کر کے میں مطمئن ہوگیا۔

شام میں، میں اکیڈمی سے پڑھا کر واپس آیا تو عمر حسب معمول کمرے میں بند تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو کمبل میں منہ چھپائے وہ بیڈ پہ دراز تھا۔ میں نے لائٹ جلائی تو وہ ہلکے سے کسمسایا۔

''عمر! بیٹا جاگ رہے ہو؟'' میں نے قصداً بلند آواز میں پوچھا۔

وہ کمبل چہرے سے ہٹاتا اُٹھ گیا۔ ''جگا کر پوچھ رہے ہیں کہ جاگ رہا ہوں؟'' وہ خفا خفا سا بولا۔

میں اس کے نزدیک بیڈ پر بیٹھ گیا، اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلایا اور اسے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

''پاپا! سوری...... سوری میں آئندہ پوری کوشش

کروں گا کہ آپ کی اُمیدوں پہ پورا اُتر سکوں۔“ وہ شرمندہ ہوا تھا۔

”اب جانے بھی دو میرے بچے۔“ میں نے اسے تھپکا۔ ”تمہارے ذہن میں جو اُلجھن اور بدگمانی ہے میں چاہتا ہوں وہ دور ہو جائے۔ آؤ میں تمہیں ایک کہانی سناؤں...... بلکہ نہیں، تمہیں ایک اچھی کہانی سناؤں۔ میری اپنی کہانی......“ عمر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ مگر میں کہانی شروع کر چکا تھا۔

☆

”میرا تعلق بنیادی طور پر غریب گھرانے سے تھا۔ ہم دو بھائی تھے، دونوں نے میٹرک کے بعد فوج میں کمیشن لے لیا۔ ماں نے کہا دونوں اتنی دور مت جاؤ۔ فوج میں ایک چلا جائے چنانچہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 71ء کی جنگ کے اثرات سے ہمارا ملک نبرد آزما تھا۔ میں نے ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کے محکمہ میں جاب کر لی۔ اک معمولی جاب...... اس وقت...... تم سمجھ سکتے ہو کہ میٹرک پاس کی کتنی اہمیت تھی۔ چنانچہ میں نے یہ نوکری لی کر لی۔ وقت گزرنے لگا۔ مجھ میں تعلیم کا اتنا جنون نہیں تھا ورنہ شاید میں آگے پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ میں اپنی زندگی سے...... جو اچھی تھی یا بُری بہرحال مطمئن تھا۔ چند سال گزرے تو ماں نے شادی کر دی۔ تمہاری ماں کو ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ اس کے اس شوق کی بدولت گھر میں کتابوں کی رونق نظر آنے لگی۔ وہ کتابوں کے معاملے میں جنونی تھی، نئی کتاب شروع کرتی تو چاہے ساری رات بیت جائے ختم کر کے اٹھتی...... میں اس سارے سیٹ اپ سے اچھا خاصا اکتانے لگا۔ وہ کسی کو اپنی کتابوں کو ہاتھ نہ لگانے دیتی، ایک بار عائشہ نے کتاب کے چند صفحے پھاڑ ڈالے۔ مجھے آج بھی یاد ہے اس نے بُری طرح عائشہ کو مارا تھا۔ وقت مزید گزرا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے، میں نے اپنی جاب میں کافی ترقی کی۔ آہستہ آہستہ ٹائپ رائٹر پرانے ہوتے گئے اور ان کی جگہ کمپیوٹرز نے لے لی۔“

”دور بدل گیا تھا، میرا کام ایسا تھا کہ دن رات میرا واسطہ ٹائپنگ سے پڑتا تھا۔ چند دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں کمپیوٹر کورس کر لوں۔ میں تو خود خاصا پریشان تھا۔ چند دن سوچتا رہا۔ تمہاری ماں سے مشورہ کیا اور بالآخر کمپیوٹر کورسز کے لیے ایک ادارے میں داخلہ لے لیا۔ کلاس میں سب مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ میں ان سے خاصا بڑا تھا۔ مجھے پہلے دن ہی خاصا عجیب سا لگ رہا تھا مگر ضبط کر کے بیٹھا رہا اور پھر میری زندگی کا سب سے حیرت انگیز لمحہ آیا...... میں آج تک...... آج تک بھول نہیں سکا۔ وہ ایک لمحہ میری سوچ اور میری زندگی میں انقلاب لے آیا اور اس کا کریڈٹ میں اس کو دوں گا وہ جو ہماری ٹیچر تھی۔ ہاہا...... ہاں ہماری ٹیچر...... جو بی ایس سی کر کے آئی تھی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل عائشہ لگی۔ میری بیٹی عائشہ جیسی اتنی کم عمر...... اتنی نازک چھوٹی سی...... وہ ہماری ٹیچر تھی۔ مجھے بے انتہا شرم آئی۔ میں نے سوچا ”اگر اس کی جگہ عائشہ ہوتی تو؟“ اور وہ لمحہ میری سوچ کو ایک حیرت انگیز تبدیلی سے روشناس کرا گیا۔

”میں نے سوچا اگر کل کو عائشہ اس جگہ ہوتی تو وہ کیا کہہ کر مجھے مخاطب کرتی؟ کیا بتاتی لوگوں کو کہ اس کا باپ زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن اسے اپنے بچوں کو پڑھانے کا بے حد شوق ہے؟ یا شاید وہ کہتی کہ ہاں اس کے پاپا صرف میٹرک پاس ہیں؟ پتا نہیں وہ کیا کہتی؟ میں نہیں جانتا مگر وہ لمحہ بہت بھاری تھا۔ اتنا

بھاری کہ مجھ سے ایک فیصلہ کروا گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے سوچا کہ مجھے ایسی زندگی نہیں گزارنی، جس میں میری بچی کے پاس یہ فخر بھی نہ ہو کہ وہ ایک پڑھے لکھے باپ کی بیٹی ہے؟“

”میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچ لیا کہ مجھے پڑھنا ہے ہاں...... میں نے یہی سوچا۔ ذرا دیکھو...... اپنی زندگی کے 35 ویں سال میں نے سوچا کہ مجھے آگے پڑھنا ہے۔ مجھے کچھ بننا ہے۔ مجھے اپنے بچوں کے لیے ایک مثال بننا ہے۔ میں نے جیسے تیسے کر کے وہ کورس مکمل کیا اور اس کے بعد ایف اے کی تیاری شروع کر دی......“

”اتنا حیران مت ہو میرے بچے!“ میں نے عمر کی پھیلی آنکھیں دیکھیں تو ہنس دیا۔ ”یہی سچ ہے۔ میں نے پیپرز دیے، اس وقت عائشہ دسویں میں تھی۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ شاید کسی حد تک ناقابل یقین بھی۔ میں اپنی بیٹی سے صرف دو سال سینئر تھا پڑھائی میں۔ کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے نا، مگر یہی سچ ہے۔ عائشہ نے فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا اور میں نے بی اے کی تیاری شروع کر دی اور اگر سچ کہوں تو تین بچوں کے ساتھ یہ آسان نہیں تھا۔ مجھ پر بہت بھاری ذمہ داریاں تھیں۔ میں اپنے گھر کا واحد کفیل تھا اور میرا بیٹا، میرا اکلوتا بیٹا ابھی بہت چھوٹا تھا۔“ میں نے بات کرتے ہوئے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

”مگر مجھے جنون تھا آگے بڑھنے کا۔ میں رات گیارہ بارہ بجے آنے کے بعد دیر تک پڑھتا رہتا۔ بی اے کلیئر ہوا تو میرے پاس انگلش پڑھنے کے لیے بچے آنے لگے۔ چند ماہ یہ سب اسی طرح چلتا رہا۔ مگر میری پھر سے وہی حالت ہونے لگی جیسے ایک نشے باز کو نشہ نہ ملنے پر ہو جاتی ہے۔ کتابیں مجھے اپنی طرف بلانے لگیں۔ میں نے چند دن سوچا اور اپنی زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ کیا۔“ میں سانس لینے کو رکا۔

عمر پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے اکنامکس میں ماسٹرز کرنے کے لیے ریگولر ایڈمیشن لے لیا...... یونیورسٹی میں میرا پہلا دن بہت عجیب تھا۔ میں بہت اعتماد سے اپنی کلاس کی طرف گیا تھا اور اپنا وہ شاندار استقبال مجھے آج تک نہیں بھولا۔ ساری کلاس مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی...... جانتے ہو کیوں؟“ میں نے حظ لیتے ہوئے پوچھا۔

عمر نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ مجھے اپنا پروفیسر سمجھے تھے۔“ میں کہتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دیا اور اس ہنسی میں عمر بھی شریک ہو گیا تھا۔

”وہ دن بڑے سہانے تھے، بڑے عجیب...... میں شروع سے ہی طبعاً سنجیدہ مزاج تھا اور اس عمر میں تو یہ سنجیدگی میرے مزاج اور میری شخصیت کا لازمی حصہ بن گئی تھی مگر میرے کلاس فیلوز تو ابھی بالکل کم عمر تھے وہ نرم سی عمروں والے بیس بائیس سالہ نوجوان، کھلنڈرے، اُدھم مچاتے، بلند قہقہے لگاتے، وہ سب مجھے بہت عجیب سے لگتے...... مگر رفتہ رفتہ میں اس روٹین میں سیٹ ہوتا گیا۔ اگرچہ یہ کچھ آسان نہ تھا، میں ان جیسا نہیں تھا، مجھ پر گھریلو ذمہ داریاں تھیں جب کہ وہ سب ابھی ان کے بوجھ سے آزاد تھے۔ مجھ میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نہ میں ان جیسا ہو سکتا تھا اور نہ وہ اتنی سی عمر میں میرے جیسی سنجیدگی اختیار کر سکتے تھے چنانچہ میں نے ان سے سمجھوتا کر لیا۔ آخر مجھے ان کے ساتھ دو سال گزارنے تھے، مگر میں جلد ہی ان کی

محفلوں میں نہ بیٹھا، کبھی ان کے ساتھ آؤٹنگ کے پروگرام نہیں بنائے، نہ کہیں ٹور پر گیا۔ میرے پاس ان چیزوں کا وقت نہیں تھا۔ مجھے وہاں سے ڈگری لینی تھی۔ وہ دو سال بڑے قیمتی تھے بڑے محنت طلب اور حیرت انگیز تھے....." میں ایک بار پھر چند لمحے کے لیے ٹھہرا۔

"اور جب دو سال بعد رزلٹ آیا تو جانتے ہو کیا ہوا؟" میں نے اسے دیکھا، عمر کے چہرے پر دبے دبے جوش کے آثار ابھرے۔

"آپ نے گوجرانوالہ میں ٹاپ کیا تھا۔" وہ بے ساختہ بول پڑا۔

"ہاں..... پنجاب یونیورسٹی سے مجھے کافی فون آئے، لیکچرر شپ کے لیے، مگر میں نہ جاسکا۔ ان دنوں میں اپنے آفس کے معاملات میں بری طرح الجھا ہوا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی۔ مجھ میں اپنے بچوں سے دور رہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میں نے مقامی کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے جاب شروع کردی۔ اگرچہ معاوضہ بہت کم تھا مگر میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اور...... اور میں تمہیں کیسے بتاؤں عمر! وہ کتنا خوب صورت احساس تھا، وہ میری زندگی کا دوسرا بہترین دن بن گیا۔ بتاؤ میری زندگی کا پہلا خوب صورت دن کون سا تھا؟" میں نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جب اللہ پاک نے مجھے تم جیسے پیارے بیٹے سے نوازا تھا۔" میں نے بے اختیار ہوکر اس کی پیشانی کو چوما اور مجھے اس کے چہرے پر زندگی دوڑتی نظر آنے لگی۔

"دوسرا دن..... وہ جب میں کلاس میں گیا، وہ سب بچے مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے احتراماً تو میں بتا نہیں سکتا اس لمحے میرے اندر کتنی خوشی پھیلی ہوئی تھی، کیونکہ یہ سب غلط فہمی نہیں بلکہ میں واقعی ان کا پروفیسر تھا۔

"پھر میرے پاؤں میں جیسے چکر سا بندھ گیا۔ مجھے اپنے لیے مشکل ٹارگٹ چننے کا مزا آنے لگا۔ اکنامکس کے بعد میں نے فلسفہ میں ایم اے کا امتحان دیا۔ بہت خشک مضمون تھا، حقیقتاً اس نے میری بہت محنت اور ڈھیر سارا وقت لیا مگر اس کا رزلٹ بھی میری توقع کے مطابق نکلا۔ گوجرانوالہ سے بس پانچ ہی لوگوں نے فلسفے کا امتحان دیا تھا۔ خوش قسمتی سے میں بہت اعلیٰ طریقے سے کامیاب ہوا۔ اس کے بعد میں نے ایم اے انگلش کا سوچا۔ مگر وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ سنا تھا یہ بڑا ہی مشکل مرحلہ ہوگا مگر اب میرے بچے بڑے ہو رہے تھے، وہ مجھ سے زیادہ وقت طلب کرتے تھے اور میری صابر سی بیوی کو بھی یہ شکوہ تھا کہ اگر میں نے بچوں کو وقت نہ دیا تو وہ میرے کنٹرول سے نکل جائیں گے۔ میں نے زیادہ وقت گھر کو دینا شروع کردیا اور مجھے بڑا عجیب سا احساس ہونے لگا، میرے بچے مجھ سے بہت دور ہو چکے تھے۔ میرے بچے، وہ بچے جن کے لیے میں سب کررہا تھا، وہ بچے جو میرے اس مقام، اس عہدے کی وجہ تھے جو مجھے یہاں تک لانے کا محرک بنے تھے..... بہت دور ہو چکے تھے، بہت دن میں نے عجیب سی اذیت اور پریشانی میں گزارے، پھر میں نے ان کو دھیرے دھیرے اپنے قریب کرنا شروع کیا، انہیں اپنا عادی بنایا، ان سے دوستانہ تعلق استوار کیا۔ میرے حق میں سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ میں نے کبھی اپنے بچوں سے سخت لہجے میں بات نہیں کی، کبھی انہیں نہیں ڈانٹا، ہمیشہ دوستانہ روابط استوار رکھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب پھر سے میرے ہوگئے۔ پھر میں نے ایم اے انگلش کی تیاری شروع کی اور اسے پاس بھی کرلیا۔"

"مجھے بارہا احساس ہوا کہ مجھ پر اللہ کا خصوصی کرم رہا۔ میں نے اتنی محنت نہیں کی مگر اس کے باوجود مجھے میرے رب نے میری ہمت اور محنت سے بڑھ کر نوازا۔ اگر کوئی اچھائی تھی تو میرے رب کی جانب سے تھی اور اگر کوئی کمی تھی تو یقیناً میری جانب سے تھی۔ میں نے تین ماسٹرز کرلیے۔ بہت اچھی جاب مل گئی۔ اپنی ایک کمپیوٹر اکیڈمی بنائی اور اب اپنی ویژن ویلفیئر سوسائٹی قائم کررہا ہوں مگر..... مجھے کیا فائدہ اس سب کا؟ سب بے کار ہے..... میں یہ سب اس لیے کرتا رہا تاکہ میرے بچوں کو زندگی کے کسی مقام پر شرمندگی نہ اٹھانا پڑے، وہ کمزور نہ پڑیں۔ ان کے لہجے میں کبھی شرمندگی نہ آجائے، وہ نا صرف اپنے باپ پر فخر کریں بلکہ خود بھی اعلیٰ مقام پر کھڑے ہوں۔ میں نے ہر روایتی باپ کی طرح یہ نہیں سوچا کہ میرے بچے میرے لیے باعث فخر ہیں۔ نہیں عمر! میں نے ہمیشہ یہ سوچا کہ میں کچھ ایسا کروں کہ وہ مجھ پر ناز کریں، مجھ جیسا بنیں بلکہ مجھ سے بھی آگے جائیں، مگر..... ایسا نہیں ہوسکا؟" میرے لہجے میں افسوس در آیا۔

"میرا بیٹا یہ سوچتا ہے کہ میں اس سے اس لیے اچھے رزلٹ کی ڈیمانڈ کرتا ہوں کہ کہیں میری پوزیشن، میرے وقار میں کوئی کمی نہ آجائے؟ اتنی غلط سوچ بیٹا! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کل کو جب تم باپ بنو تو تمہارے بچے بھی تم پر فخر کرسکیں۔ تمہیں آئیڈیلائز کرسکیں..... میں نے تمہیں اس لیے نہیں ڈانٹا کہ اس سے میرے غرور اور انا پر کوئی چوٹ پڑتی ہے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بھی میری طرح عمر! دوسروں کو مثال بنانے کی بجائے خود مثال بنو۔ خود کو آئیڈیل بناؤ تاکہ لوگ تم جیسا بننے کی آرزو کریں۔ اگر میں آج کچھ ہوں تو صرف اپنے بچوں کی وجہ سے ہوں۔ شاید یہ پہلا بیان ہے جو اس دنیا میں کوئی باپ دے رہا ہے ورنہ ہمیشہ انتساب والدین کے نام ہی جاتا ہے، مگر سچ یہی ہے۔"

"مجھے اس مقام پر لانے والا محرک میرے بچے ہی تھے۔ وعدہ کرو عمر! تم خود کو بہتر کروگے؟" میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلکے سے جھنجوڑا۔

"پاپا! مجھے آپ پر فخر ہے۔ آئی لو یو پاپا..... آئی ایم سوری..... پلیز....." وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا، ایک ہی لمحے میں وہ مختلف بیان دیتے ہوئے وہ مجھے بے حد پیارا لگا۔ میں نے اسے گرم جوشی سے خود میں سمولیا۔

"وعدہ کرتے ہو پھر؟"

"جی پاپا! میں..... میں بھی آپ جیسا بنوں گا۔"

اس کے لہجے میں فخر تھا، میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ اور میرا دل اپنے رب کے آگے مزید شکر بجا لایا۔ بے شک یہ اس پاک ذات کا کرم ہی تو تھا جس نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر نوازا تھا اور میری زبان میں اتنا اثر رکھا تھا۔ ورنہ تو..... میں نے ہمیشہ باپ کو بیٹے کے پیچھے چیختے چلاتے اور خون جلاتے ہی دیکھا تھا۔

عمر کی پیشانی چومتے ہوئے میری آنکھوں سے تشکر کے دو موتی بہہ گئے تھے۔